

بہار پاکستان

05-20-2017



فہرست

بچوں کی دنیا

۱. آخری گولی.....

معاشرہ اور ثقافت

۳. بے چین.....

۶. جنید جمشید دلوں میں زندہ رہے گا.....

۸. سائنٹ کٹر.....

۹. ہائی ٹیک.....

۱۱. ہمارا گھر مندر بن گیا تھا.....

آخری گولی

مصنف: سفیان خان

وہ کل پانچ افراد تھے، تین مرد اور دو عورتیں۔ شام کے وقت ساحل سمندر کے ایک ویران گوشے میں، پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں طرف سمندر کی منہ زور لہریں ٹھانٹیں مار رہی تھیں اور بائیں طرف ایک اونچی پٹان سر اٹھائے کھڑی تھی، جو کسی پہاڑی کا باقی ماندہ حصہ تھی۔ چند قدم دور چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں اس گروپ کے چیف کا نام تھا شفقت اگرچہ شفقت نام کی کوئی چیز اس کے چہرے پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا، چٹان کی طرح مضبوط اور پتھر کی طرح پتھریلا۔ چیف نے اچانک پہلو بدلا اور بولا :

"خواتین و حضرات آپ سب ملک کی خفیہ تنظیم کے ارکان ہیں۔ آپ کی مناسب کارکردگی کو مد نظر رکھ کر آپ کو ایک خفیہ مشن سونپا گیا۔ آپ میری ہدایات کے مطابق اپنا کام احسن طریقے سے سر انجام دیتے رہے مگر پھر ہم میں سے کسی نے ایک "کارنامہ" بھی سر انجام دے دیا، خفیہ سی ڈی کے چند منتخب حصے دشمن کے ہاتھوں فروخت کر دیے گئے۔"

چیف پھر اچانک خاموش ہو گیا وہ گرم نظروں سے ایک ایک کا چہرہ بڑھ رہا تھا، ہر ایک کو بری طرح گھور رہا تھا، بات ہی ایسی تھی، ملک سے غداری اور تنظیم سے بے وفائی۔ چیف نے سرد ہوا سے بچائو کے لیے عمدہ ادنیٰ منظر لے رکھا تھا۔ اس نے اپنا چرمی تھیلا کھول کر اس میں سے ایک سیاہ بڑا پستول نکالا۔ اس ماحول میں اس کی کرخت آواز پھر گونجی:

"غداری کی سزا موت ہوتی ہے، آپ سب جانتے ہیں کہ خفیہ ادارے غدار کو موت کے گھاٹ اتار کر دوسرے برے افراد کے لیے عبرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کیا کسی کو اس بات پر اعتراض تو نہیں کہ غدار کو مارا نہ جائے؟"

"نو چیف" چند ملی جلی آوازوں نے سر جھکا دیا۔
"گلد تو گویا آپ سب اس تنظیم کے ایچے کارکن ہیں۔" چیف نے اپنی جیب میں سے تین گولیاں نکال کر پستول کو کھولا اور اس کے چیمبر میں وہ گولیاں ڈال دیں۔ پھر پستول کی نال ہوا میں بلند کی اور ٹریگر دبا دید۔ چیف نے دو گولیاں فضا میں چلا کر ضائع کر دیں۔ اب آخری گولی باقی تھی۔

"غدار کی قسمت کا فیصلہ اب یہ آخری گولی کرے گی۔" چیف نے زبان کھولی تو سب کے چہروں پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ غدار کی نامزدگی کے بغیر ہر ایک شخص اپنے آپ کو مجرم اور غدار سمجھ رہا تھا کہ کہیں غداری کا اس پر کوئی الزام تو نہیں لگ گیا۔

چیف نے پستول دوبارہ کھول کر اس کا چیمبر گھما دیا

اور پھر اچانک پستول بند کر دیا۔ اس نے سب کو ترجیحی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "معزز خواتین و حضرات آپ سب شریف، ایمان دار اور پارسا افراد ہیں۔ آپ ملک کی اس خفیہ تنظیم کے ساتھ بھی متعلق ہیں۔ میں کسی بھی فرد پر غداری کا الزام لگا کر اس پر کیچڑ اچھالنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ یہ بات بہت بڑا "گناہ" ہے کہ کسی پر بہتان باندھا جائے، لہذا میں اس آخری گولی کا ہی فیصلہ تسلیم کروں گا دیکھئے، یہ گولی کیا فیصلہ کرتی ہے۔ میں اس عمل کا آغاز خود سے کرتا ہوں۔ میری آپ سب کے لیے دلی دعا ہے کہ آخری گولی صرف غدار کا ہی کام تمام کرے۔ مجھے اس طریقے پر بھروسہ ہے۔ میں چند سال قبل بھی آخری گولی کی مدد سے غدار کو سزا دے چکا ہوں بلکہ قسمت غدار کو خود ہی ڈھونڈ لیتی ہے۔"

چیف نے پستول کی نالی اپنی کپٹی پر رکھی، آنکھیں بند کیں اور پستول کی لمبی دبا دی

"ٹک۔"

اس نے آنکھیں کھول کر خدا کا شکر ادا کیا اور پستول شاہ صاحب کے حوالے کیا۔ شاہ صاحب نے گہرا سانس لیا اور پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ کر پستول چلا دیا

"ٹک۔"

شاہ صاحب جی کر مراٹھے تھے۔ انہوں نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پستول عبدالقیوم صاحب کے حوالے کر دیا۔ عبدالقیوم صاحب چار بچوں کے باپ تھے انہوں نے زیر لب خدا سے دعا کی۔ ساری دنیا ان کے سامنے پل بھر میں سمٹ آئی۔ وہ غدار تو نہیں تھے مگر اس آخری گولی کا بھلا کیا بھروسہ۔ انہوں نے خالق کائنات کو پکار کر پستول کی نالی اپنے ماتھے پر رکھی اور اس کی لمبی دبا دی۔

"ٹک۔"

وہ بچ گئے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کا تہیہ کر لیا۔

پستول اب شمشہ کے ہاتھ میں تھا۔ شمشہ سخت گیر عورت دکھائی پڑتی تھی۔ عمر چالیس سال، تین بیٹوں کی ماں اور ایک بوڑھی بیمار ماں کی واحد خبر گیر۔ اس نے پستول تمام کر قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا: "چیف میں غدار نہیں ہوں، آپ میرا ریکارڈ چیک کر لیں اور کوئی ثبوت مل جائے تو مجھے الٹا اڑکا کر میری چوڑی اتار دیں، پھر مجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیں۔"

"نہیں، آپ تو بہت اچھی ہیں۔" چیف نے طنز کیا۔

"تو پھر؟"

"پھر فیصلہ آخری گولی کا ہو گا، جو اس پستول کے چیمبر میں گھوم رہی ہے۔"

"چیف میرے تین چھوٹے چھوٹے بیٹے ہیں جو رات کے کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور میری بوڑھی

ماں میرا حد درجہ شریف خاندان۔"

"اوہ آپ مجھے رلانے والی باتیں نہ کریں۔" چیف کی آواز بھی رندہ گئی۔ وہ اگرچہ اداکاری کر رہا تھا مگر کامیاب اداکاری کر رہا تھا۔

چیف کے بے لچک رویے اور بے لحاظ نظروں نے شمشہ کو بتا دیا کہ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ تب اس نے لرزتے ہاتھ سے پستول بلند لیا۔ پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ لی اور کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے لمبی دبا دی۔

آواز صرف "ٹک۔" کی ابھری

چیف نے اسے نئی زندگی کی مبارک باد دی، جو اس نے شکر یہ کے ساتھ قبول کی۔

پستول اب مس کرن کے پاس تھا۔ کرن تیس سالہ لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر حد درجہ معصومیت کا غلبہ تھا۔ چیف نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ آخری گولی اس پستول میں جہاں کہیں بھی تھی، گھوم گھام کر پستول کے نالی کے عین سامنے یا بالکل قریب آچکی تھی۔ پستول چار بار چلایا جا چکا تھا اور اب خطرہ نوے فیصد سے بھی بڑھ چکا تھا، آریا پار والا معاملہ تھا۔

"گولی چلائیں مس کرن" چیف نے اسے حکم دیا۔

تب پستول کرن کی گود میں پڑا تھا۔ اس نے شش و پنج میں مبتلا ہو کر پستول تمام لیا۔ اس نے ذرا ٹھہر کر کہا: "اندھی گولی کا فیصلہ اندھا ہوگا، میں نے کیا کیا ہے چیف کہ مجھے بھری جوانی میں موت کی گھاٹی میں دھکیلا جا رہا ہے۔"

چیف نے سخت لہجہ اختیار کیا: "اس پستول میں چھ گولیوں کی جگہ ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ آخری گولی اب نالی کے سامنے پہنچ چکی ہو۔ معاملہ اگرچہ بہت خطرناک تھا مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بعد میں پستول کو اپنی کپٹی پر رکھ کر چلائوں گا اگر ایسا وقت یا تو" چیف نے ان سب کو دیکھ کر کہا۔ "میں خود کو سب سے پہلے سزاوار سمجھتا ہوں، اس لیے اس عمل کا آغاز میں نے خود سے کیا تھا اور انجام بھی وقت پڑنے پر خود ہی پر کروں گا مس کرن بے دھڑک گولی چلائیں اگر یہ غدار وطن نہ ہوئیں تو ان کی زندگی خواب نہیں ہو گی۔"

خوف زدہ کرن خاموش بیٹھی رہی۔

"مس کرن گولی چلائیں، اپنے چیف کا حکم ٹالنا بھی جرم ہے۔" پھر کرن نے اچانک ہاتھ سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ فضا دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔ چٹان پر بیٹھے ہوئے آبی پرندے اور سمندری بگڑے اڑ گئے تھے۔ چیف جھج کر پتھر پر سے نیچے گرا تھا اور اس نے اپنا سینہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تمام رکھا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے ریت پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ کرن ماہر نشانہ انداز تھی وہ کئی بار نشانہ اندازی کے مقابلوں میں انعام حاصل کر چکی تھی۔ اس نے اپنے فن کا مظاہرہ چیف کے عین دل پر کیا تھا۔ چیف کا حکم نہیں ٹالا تھا۔ گولی تو چلائی تھی مگر اپنے سر پر نہیں، چیف کے سینے پر کرن نے وہ پستول پھینک

کر اپنے لباس میں سے ایک مائوز نکال کر باقی ماندہ افراد پر تان لیا تھا تاکہ کوئی اسے روک نہ سکے۔ وہ اگلے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی تاکہ چند قدم دور جا کر اپنی گاڑی میں سوار ہو سکے۔ اس نے گھوم کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا اور یہی لمحہ قیامت بن گیا اچانک اسے کسی نے فضا میں گیند کی طرح اچھال دید۔ وہ منہ کے بل زمین پر گری تو مائوز بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کو شاید صاحب نے اپنے کھلبے میں قابو کر لیا۔ اس پر حیرت کا پہلا ٹوٹ پڑا کہ خاک میں غلط چیف پتھر پر پاؤں دھرے کھڑا تھا اور اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ چیف کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پستول تھا جو اس نے یقیناً اپنے اوئی مفلز میں سے نکالا تھا وہ آخری گولی سے بچ نکلا تھا۔

چیف نے کہا: "مجھے تجھ پر پہلے ہی یقین کی حد تک شک تھا۔ میری خفیہ اطلاع کے مطابق تو نے ہیروں والے زبورات خریدے ہیں اور دنیا کے ایک مہنگے شہر میں بنگلہ بھی۔ کرن بی بی وہ آخری گولی، پٹاخا گولی تھی۔ میں اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ غدار تلاش کرنے کے لیے اندھی گولی کی مدد لیتا۔ میں نے جب جیمبر کو گھمایا تو بند کرتے وقت میں نے پستول کا جیمبر اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کی مدد سے یوں روکا تھا کہ پٹاخا گولی پانچویں خانے میں تھی۔ میں نے تم لوگوں پر نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا اور یوں غدار لڑکی پکڑی گئی۔"

کرن جب تم مائوز تمام کر قدم قدم، اگلے پاؤں پیچھے ہٹ رہی تھی تو میری طرف تیرا دھیان نہیں تھا اور جب تم نے گاڑی کی طرف پلٹ کر مجھے ایک لمحہ دیا تو میں نے تجھے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا، شاید تیرے علم میں نہ ہو کہ میں ایک ماہر نفسیات ہوں اور نہجا ماسٹر بھی۔"

§§§

بے چین

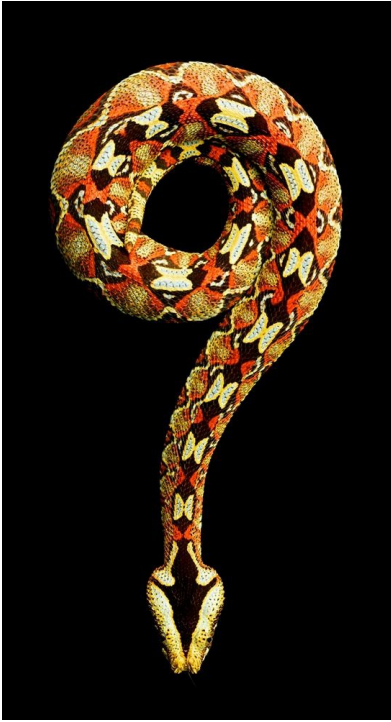
مصنف: سفیان خان

میکوٹن نے سامنے بیٹھے امیدوار کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ دبلا پتلا گندی رنگت کا آدمی کام کی تلاش میں آیا تھا۔ میکوٹن نے اُسے بتایا کہ یہ کام بہت مشقت والا اور عارضی ہے تمہیں نقد ادائیگی کی جائے گی۔ یہ پرانی عمارتیں گرانے کا کام ہے جس میں خطرہ بھی ہے لیکن بیمہ یا صحت کے علاج کے سلسلے میں ممداری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

رام لعل نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس کا تعلق بھارتی علاقے راجستھان کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ وہ طب کی تعلیم پانے آئرلینڈ آیا تھا۔ اس کا آخری سال تھا، اپنی ضروریات پورا کرنے کی خاطر اُسے مزید آمدن درکار تھی۔ اسی لیے وہ ٹھیکیدار کے دفتر عارضی ملازمت حاصل کرنے آیا تاکہ موسم گرما کی چھٹیوں میں کچھ آمدن حاصل کر سکے۔ میکوٹن نے رام لعل سے کہا، وہ کل سے کام پر جائے۔ اوقات صبح ۷ بجے سے شام کے ۷ بجے ہیں۔ تمام مزدوروں کو ٹرک صبح ۶ بجے اسٹیشن کے سامنے سے لینا ہے۔ ان کا انچارج بل کیمرن ہے، میں اسے بتا دوں گا۔ رام لعل دفتر سے باہر آیا اور ایک کمرہ تلاش کرنے لگا۔ کوشش کے بعد اسے اسٹیشن کے قریب ایک کمرہ مل گیا۔ اتوار کے روز وہ اپنے مختصر سلمان کے ساتھ اس کمرے میں مستقل ہو گیا۔ دوپہر کے وقت وہ بستر پر لیٹا اپنے گائوں کی پہچانوں، کھیتوں اور کسانوں کو یاد کرتا اور سوچتا رہا تھا کہ جلد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر بن کر گائوں چلا جائے گا۔ پیر کی صبح رام لعل جلدی اٹھا اور ۶ بجے کے قریب مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرک پہنچ گیا۔ اس وقت تک ۱۲ افراد جمع ہو چکے تھے۔ رام لعل کچھ دور ہٹ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں گروپ انچارج بھی پہنچ گیا۔ اس کے پاس مزدوروں کی فہرست تھی اور وہ سب کو جانتا تھا۔ رام لعل اُس کے قریب پہنچا تو فورمین نے پوچھا ”کیا تم وہی کالے آدمی ہو جسے میکوٹن نے ملازم رکھا ہے۔“ اُس نے کہا ”ہاں میں ہی ہری کشن رام لعل ہوں۔“ فورمین بل کیمرن کا رویہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار تھا۔ اس کا قد ۶ فٹ ۱۳ انچ اور جسم طاقتور تھا، شکل سے بھی وہ ایک پہلوان معلوم ہوتا۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا اور رام لعل سے کہا ”جانو ٹرک میں بیٹھو۔“ دوران سفر ایک شخص نے پوچھا ”تم کہاں سے آئے ہو۔“ اس نے کہا ”بھارت کے علاقے راجستھان سے۔“ آدمی نے پوچھا ”کیا تم عیسائی ہو؟“ رام لعل نے کہا ”میں ہندو ہوں۔“ اُس شخص نے پھر جس کا نام برنس تھا، باقی لوگوں سے رام لعل کا تعارف کرایا۔ ایک

شخص نے کہا ”تمہارے پاس کھانا نہیں ہے؟“ رام لعل نے کہا ”میں کل سے لاؤں گا۔“ دوسرے شخص نے پوچھا ”کیا تم نے ایسا مشق کام پہلے کیا ہے؟“ رام نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس شخص نے کہا ”تمہیں مضبوط جوتے اور دستانے بھی خریدنے ہوں گے۔“ باتوں باتوں میں رام لعل نے بتایا کہ وہ طب کا طالب علم ہے اور اسے مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے تاکہ کچھ زائد آمدن حاصل کر سکے۔ ٹرک ڈیولڈ روڈ پر ایک کچے راستے پر درختوں کے قریب رک گیا۔ وہاں کومبر کے کنارے شراب کی ایک پرانی فیکٹری تھی جسے گرایا جاتا تھا۔ عمارت کے مالک کی خواہش تھی کہ کم سے کم رقم خرچ ہو۔ لہذا اس نے کسی بڑی کمپنی کے بجائے ٹھیکیدار میکوٹن سے بات کی جو مناسب رقم میں بغیر مشینری کے عمارت گرانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میکوٹن کے مزدوروں نے یہ کام بھاری ہتھوڑوں اور کدالوں کی مدد سے کرنا تھا۔ میکوٹن کو یہ بھی لالچ تھا کہ عمارت ٹوٹنے سے نکلنے والی لکڑی اور سیکڑوں ٹن اینٹیں فروخت کر کے اضافی آمدنی حاصل ہوگی۔ مزدور اوزار اٹھائے عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے پاس بڑے ہتھوڑے، لمبی چھینیاں اور رستے تھے۔ فورمین نے کہا ”چلو ابھی کام شروع کرو۔ ہم سب سے پہلے چھت کی ٹائلیں توڑیں گے۔“ رام لعل نے اندر چھت دیکھی جو کسی چار منزلہ عمارت کے برابر اونچی تھی۔ اسے اونچائی سے خوف آتا تھا۔ ایک آدمی نے پرانی لکڑی کا دروازہ توڑا اور آگ جلا کر چائے کا پانی رکھا۔ سب لوگوں نے تام چینی کے مگ نکالے اور چائے پینے لگے۔ رام لعل نے سوچا کہ کل وہ مگ بھی خرید لے گا۔ تاہم برنس نے اپنے مگ میں رام لعل کو چائے دی۔ چھت پر کام شروع ہو گیا۔ ٹائلیں اکھاڑ کے نیچے پھینکی جانے لگیں۔ ۱۲ بجے کے بعد کھانے کا وقفہ ہوا اور سب لوگ نیچے آگئے۔ چائے بنی اور رام لعل کے سوا سب مزدوروں نے کھانا کھایا۔ اس نے اپنے ہاتھ دیکھے جو جگہ جگہ سے جھل گئے تھے اور سارا جسم دکھ رہا تھا۔ برنس نے رام لعل سے کہا ”لو تم بھی سینڈویچ کھا لو، میرے پاس کافی ہیں۔“ بل کیمرن سامنے بیٹھا تھا، اس نے برنس سے کہا ”تم کیا کر رہے ہو۔ کالے کو اپنا کھانا خود لانے دو، تم صرف اپنی فکر رکھو۔“ برنس نے اپنی نظریں جھکا لیں کیونکہ کوئی بھی فورمین کے آگے نہیں بول سکتا تھا۔ پورے ہفتے کام چلتا رہا۔ عمارت کی چھت، دیواریں، دروازے اور کھڑکیاں نیچے ملے کے ڈھیر پر گرتی رہیں۔ رام لعل کے لیے یہ سخت محنت کا کام تھا، ہاتھ زخمی ہو گئے لیکن رقم کی خاطر وہ محنت کرتا رہا۔ اس دوران فورمین بل کیمرن جسے لوگ ”بگ بلی“ بھی کہتے تھے، رام لعل کے پیچھے لگا رہا۔ مشکل سے مشکل کام اسے دیا جاتا اور وہ بے عزتی کرنے کا بھی کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔ ہفتے کے روز تک اندر کا کام پورا ہو چکا۔ اب باہر کی دیواریں باقی تھیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دیواروں میں نیچے ڈانٹاٹ لگایا جاتا تو ایک ساتھ پورا ملے نیچے آ گرتا۔ لیکن میکوٹن کے

لے یہ طریقہ ناقابل عمل تھا۔ اس کے لیے لائسنس کی ضرورت تھی جو شمالی آئرلینڈ میں مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ محکمہ ٹیکس اور انشورنس والوں کو بھی ادائیگی کرنا پڑتی۔ لہذا یہ سارا کام مزدوروں کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ خود کو خطرہ میں ڈالتے دیواریں ہتھوڑوں سے توڑ رہے تھے۔ کھانے کے وقت فورمین نے ادھر ادھر گھوم کر کام کا جائزہ لیا اور پھر کہا کہ اس طرف کی دیوار کا بڑا حصہ پہلے توڑنا ہے۔ پھر وہ رام لعل کی طرف مڑا اور کہا ”میں چاہتا ہوں کہ تم اوپر چڑھو اور جب دیوار گرنے لگے تو اسے باہر کی طرف دھکا دو۔“ بل کیمرن جانتا تھا کہ رام لعل اونچائی سے ڈرتا ہے۔ رام لعل نے جواب دیا ”اس پوری دیوار میں دراڑ پڑی ہوئی ہے۔ جو بھی اوپر گیا، وہ اس کے ساتھ ہی گرے گا۔“ بل کیمرن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، وہ چیخ کر بولا ”تم مجھے میرا کام مت سمجھاؤ۔ کالے آدمی، جیسا تم سے کہا، وہی کرو۔“ رام لعل اٹھا اور فورمین کے سامنے جا کر بولا۔ ”مسٹر کیمرن! ایک بات صاف ہوئی چاہیے۔ میرا تعلق راجپوت قبائل سے ہے۔ گو اس وقت میرے پاس تعلیمی اخراجات کے لیے رقم کم ہے لیکن میرے آباء واجداد میں دو ہزار سال قبل راجہ، مہاراجہ، شہزادے اور فوج کے سپہ سالار گزرے ہیں۔ اس وقت تم لوگ بندروں کی طرح چاروں ہاتھ پیر پر چلتے اور کپڑوں کی جگہ کھال پہنتے تھے۔ براہ مہربانی آپ میری بے عزتی کرنا بند کر دیں۔ ہر انسان کی اپنی عزت ہوتی ہے جس کی حفاظت اس کا فرض ہے۔“ رام لعل کی یہ مختصر تقریر سب لوگوں نے دم بخود سنی۔ بل کیمرن کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے چیخ کر گالی دی اور کہا ”اچھا تو تم واقعی عزت دار تھے۔“ ساتھ ہی اس نے رام لعل کے منہ پر اٹلے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ بیچارہ رام لعل زمین سے اڑ کر کئی فٹ دور جا گرا۔ برنس کی آواز آئی ”ڈر کے زمین سے اٹھنا مت، ورنہ بگ بلی تمہیں جان سے ہی مار دے گا۔“ رام لعل نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیوار بل کیمرن مٹھیاں بند کئے اس کے اٹھنے کا منتظر تھا۔ رام لعل کا اس سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی سے پڑا رہا۔ دکھ اور بے عزتی کی تکلیف سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بند آنکھوں سے رام نے خود کو وطن میں پایا جہاں اس کے آباء واجداد گھوڑوں پر سوار، تلواروں اور نیزوں سے لیس آس پاس سے گزرتے اسے صرف ایک لفظ کہہ رہے تھے ”انتقام، انتقام۔“ تمہیں اپنی بے عزتی کا انتقام لینا ہوگا۔“ رام لعل خاموشی سے اٹھا اور کام میں لگ گیا۔ سارا دن نہ وہ کسی سے بولا اور نہ کوئی بات کی۔ اس رات جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو باہر گرج چمک ہو رہی تھی اور طوفانی بارش کے آثار تھے۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس سے انتقام لے سکے۔ تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہونے لگی۔ اس کی نظر کھڑکی کے شیشہ پر پڑی جہاں بارش کی بوندیں ایک قطار کی شکل میں بہنے لگی تھیں۔ شیشہ پر پڑی مٹی کی وجہ



چند سینڈ بعد اس نے پائپ اور تمباکو کی تھیلی نکالی، پائپ بھر کر جلایا اور پینا شروع کر دیا۔ رام لال مایوسی اور نامیدی کا شکار تھا کہ اس کی چال نے اپنا کام نہیں دکھایا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بے یقینی سے جیکٹ کی طرف دیکھا۔ اسے چند سینڈ کے لیے جیکٹ کے ایک کنارے پر کوئی چیز چلتی نظر آئی۔ جیکٹ کی جیب میں پائپ جانے والے چھوٹے سے سوراخ سے سانپ نکل کر اندرونی سلائی میں چھپ گیا تھا۔ شام کو واپسی کے وقت فورٹین نے اپنی جیکٹ اتار کر اپنے برابر رکھ لی اور مقررہ مقام پر سب لوگ اتر کر اپنے گھر جانے لگے۔ رام لال نے برنس سے پوچھا کہ کیا بل کیمرن کے بیوی بچے ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ رام لال اپنے کمرے پہنچا اور دل سے دعا کرنے لگا کہ میں اپنی بے عزتی کا بدلہ بل کیمرن سے لینا چاہتا تھا لیکن اس کے بیوی بچوں کو نقصان پہنچانا میرا مقصد ہر گز نہیں۔ اتوار کا دن بھی انہی سوچوں میں گزر گیا۔ پیر کی صبح بل کیمرن اور اس کے بیوی بچے صبح ۶ بجے کے قریب اٹھے اور ناشتا کرنے باورچی خانے میں جمع ہو گئے۔ بل کیمرن کام پہ جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس نے بیٹی سے کہا کہ ذرا میری جیکٹ تو لانا۔ وہ الماری سے نکال کر لائی۔ بل نے کہا: ”اسے دروازے کے پیچھے ٹانگ دو۔ میں ابھی لیتا ہوں۔“ جب بیٹی نے جیکٹ ٹانگی تو وہ پھسل کر باورچی خانے کے فرش پر گر پڑی۔ بیٹی نے غصے سے کہا ”تم سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ جیکٹ اٹھا کر اچھی طرح ٹانگو۔“ ”بابا، یہ آپ کی جیکٹ سے کیا چیز گری۔“ بگ بی کی بیوی، بیٹی اور سب نے اس طرف دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جاندار فرش پر پڑا چمکیلی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

پرندے، سانپ اور دیگر جانور فروخت ہوتے تھے۔ اسے دراصل ایک چھوٹے زہریلے سانپ کی تلاش تھی۔ دکاندار نے بتایا کہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ کل ہی میرے پاس ایک چھوٹا سانپ آیا ہے جو آراکھیراناگ (Saw Scaled Viper) کہلاتا ہے۔ یہ سانپ مغربی افریقہ سے عرب، ایران، پاکستان اور بھارت کے خشک اور نم علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰-۱۵ سینٹی میٹر تک، رنگ گہرا بھورا اور جسم پتلا ہوتا ہے۔ زہریلے دانت شکار کی جلد پر سوئی جیسے دو سوراخ چھوڑتے ہیں۔ زہر اتنا تیز اثر ہوتا ہے کہ دو تین گھنٹوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ موت کا سبب دماغ میں خون کا اخراج ہوتا ہے۔ رام لال نے دکان کے مالک سے پوچھا کہ اس سانپ کی کیا قیمت لوگے؟ کچھ دیر بحث کے بعد سودا ۳۵۰ روپے میں طے ہو گیا۔ رام لال سانپ کو ایک ڈھکن والی بوتل میں بند کر کے گھر چلا آیا۔ لندن سفر کے لیے رام لال نے ایک سگڑا بکس خرید لیا۔ اسے خالی کر کے اس میں پندرہ چھوٹے سوراخ کیے اور سانپ نرم پتوں کے ساتھ سگڑا بکس میں بند کر کے اسے اچھی طرح ٹیپ سے بند کر دیا۔ اس طرح لندن واپسی کا سفر شروع ہوا۔ شام تک رام لال اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے سگڑا بکس نکال کر دیکھا۔ سانپ بالکل صحیح حالت میں سیاہ چمک دار آنکھوں سے رام لال کو گھور رہا تھا۔ رام لال نے شیشے کا ایک ڈھکن دار مرتبان خالی کیا تاکہ صبح استعمال کیا جائے۔ صبح جلدی اٹھ کر اس نے انتہائی احتیاط سے سانپ کو سگڑا بکس سے مرتبان میں منتقل کیا۔ مضبوطی سے ڈھکن لگایا اور اسے اپنے لُچ بکس میں حفاظت سے رکھ دیا۔ مقررہ وقت وہ اسٹیشن پہنچا جہاں سے ٹرک سب مزدوروں کو لیے کام کی جگہ جاتا تھا۔ بل کیمرن کی یہ عادت تھی کہ کام شروع کرنے سے پہلے وہ اپنی جیکٹ اتار کر کسی شاخ پہ اتار دیتا تھا۔ کھانے کے وقفے میں وہ جیکٹ کی جیب سے اپنا پائپ اور تمباکو کی تھیلی نکال کر پائپ ضرور پیتا۔ رام لال کا ارادہ تھا کہ وہ موقع پا کر سانپ کو بل کیمرن کی جیکٹ کی جیب میں چھوڑ دے گا۔ پھر وہ جیکٹ کی جیب سے پائپ اور تمباکو نکالے گا۔ اس دوران سانپ بل کیمرن کو ڈس لے گا۔ بل کیمرن گھبرا کر ہاتھ جیب سے نکالے گا، تو سانپ اس کے ہاتھ سے لٹکا ہوگا کیونکہ اس کے دانت گوشت میں گڑے ہوں گے۔ منصوبے کے مطابق رام لال کسی بہانے ۱۱ بجے کے قریب اٹھا۔ اپنا لُچ بکس کھول کر سانپ کا مرتبان نکالا، ڈھکن کھول کر بل کیمرن کی جیکٹ کی داہنی جیب میں اتار دیا اور واپس آکر کام میں لگ گیا۔ کھانے کے دوران سب لوگ دائرے میں بیٹھ کر سینڈوچ کھانے لگے۔ رام لال کا دل کھانے میں نہیں لگ رہا تھا، وہ زبردستی سب کے ساتھ بیٹھا۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر فورٹین کی جیکٹ کی طرف دیکھتا۔ آخر کار بل کیمرن نے کھانا ختم کیا، اُٹھ کر اپنی جیکٹ کی طرف گیا اور داہنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

سے پانی کی قطار سیدھی کے بجائے لہراتی ہوئی بننے لگی۔ اچانک رام لال کی نظر کونے پر پڑی ڈریسنگ گائون کی ڈوری پہ گئی جو ہوا سے نیچے گر گئی تھی۔ گری ڈوری ایسی گتی تھی کہ پتلا سانپ کندلی مارے بیٹھا ہو۔ رام لال سمجھ گیا کہ اسے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ اگلے روز رام لال بذریعہ ریل بیلفاسٹ گیا اور اپنے سکھ دوست سے ملا۔ رنجیت سکھ بھی اس کی طرح طالب علم تھا لیکن اس کے والدین دولت مند تھے اور اسے ماہانہ اچھی رقم اخراجات کے لیے بھیجتے۔ رام لال نے اس سے کہا کہ مجھے گھر سے اطلاع ملی ہے، میرے والد بستر مرگ پر ہیں۔ میں سب سے بڑا بیٹا ہوں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے واپس ہندوستان جانا ہوگا۔ رنجیت سکھ نے کہا کہ ہاں یہی روایت ہے کہ والد کے انتقال کے وقت بڑا بیٹا اس کے پاس ہو۔ رام لال نے کہا، میرا مسئلہ ہوائی سفر کے ٹکٹ کا ہے۔ میں کام بھی کر رہا ہوں لیکن میرے پاس کافی پیسے نہیں۔ کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے دو گے؟ میں زندہ کام کر کے تمھاری رقم لوٹا دوں گا۔ سکھ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں کل بینک سے رقم نکلا کر تمھیں دے دوں گا۔ اس روز شام کو رام لال اپنے ٹھیکیدار مسٹر میکٹون سے ملا اور اپنے والد کے بارے میں بتایا کہ اس کا آخری وقت قریب ہے۔



میں اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا مذہبی طریقہ ہے کہ مرنے والے کی آخری رسوم اس کا بڑا بیٹا ادا کرے۔ رام لال نے یہ بھی کہا ”میں نے ہوائی کرائے کی رقم دوست سے ادھار لی ہے۔ اگر میں کل کی پرواز سے روانہ ہو جاؤں تو اگلے ہفتے واپس آ سکتا ہوں۔“ ٹھیکیدار نرم دل آدمی تھا، اس نے کہا ”ٹھیک ہے! تم جاسکتے ہو۔ اگر تم وعدے کے مطابق واپس پہنچ جاتے ہو تو انہی شرائط پر دوبارہ کام شروع کر دینا۔“ رام لال نے شکریہ ادا کیا اور واپس آ گیا۔ اگلے روز اس نے اپنے سکھ دوست سے رقم ادھار لی اور بذریعہ ریل لندن پہنچ کر بھارت جانے کے لیے ٹکٹ خرید لیا۔ اس طرح ۲۴ گھنٹوں کے اندر وہ ہمیں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایک دکان پر پہنچا جہاں پالتو

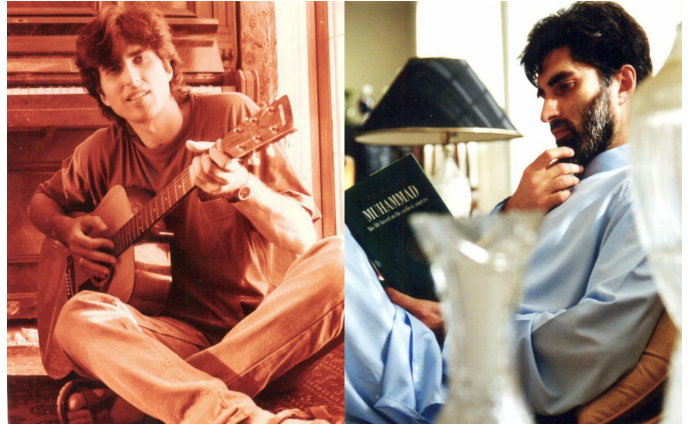
اس کی دانتی کلائی پر سوئی کی نوک کے برابر دو انتہائی باریک سوراخ ہو چکے تھے۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ سب لوگ کام کے لیے اٹھ گئے۔ عمارت توڑنے کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سارا ملہ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ دو گھنٹے بعد بل کیمرن نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا، اسے کچھ پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہتھوڑا ہاتھ سے رکھا اور اپنے ساتھی سے کہا ”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں ذرا دیر سایہ میں آرام کر لیتا ہوں۔“ پھر وہ درخت کے نیچے بیٹھا سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کے پورے جسم کو جھکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ کر گر۔ سب سے پہلے برنس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پیٹرن کو آواز دی اور کہا: ”بگ بلی بہت بیمار لگ رہا ہے۔ میری بات کا اس نے جواب بھی نہیں دید۔“ سب مزدوروں نے کام چھوڑ دیا اور اس درخت کے پاس آگئے جہاں بل کیمرن زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ان میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ پیٹرن نے رام لعل کو آواز دی کہ اوسر آؤ اور اسے دیکھو۔ تم طب کے طالب علم ہو، تمہارا کیا خیال ہے؟ رام لعل کو کسی معاینے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے جھک کر نبض دیکھی اور پیٹرن سے کہا کہ یہ تو مر چکا۔ پیٹرن نے کہا ”سب لوگ یہیں ٹھہریں۔ میں ایبولینس بلاتا اور ٹھیکیدار میکوئن کو بھی مطلع کرتا ہوں۔“ وہ پھر پیدل سڑک کی طرف روانہ ہوا تاکہ ہاتھ سے فون کر سکے۔ ایبولینس کے پہنچنے پر بل کیمرن کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے معاینہ کیا اور بتایا کہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس شخص کی موت واقع ہو چکی۔ میکوئن بھی پریشانی کے عالم میں ہسپتال پہنچ گیا۔ پولیس اور عدالتی کارروائی میں چند روز لگے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق بل کیمرن کی موت قدرتی طور پر ہوئی۔ وجہ دماغ میں شدید اخراج خون تھا۔ عیسائی مذہب کے طریقے کے مطابق تدفین ہوئی جس میں اس کے خاندان، میکوئن اور دیگر ساتھی بھی شریک ہوئے۔ رام لعل نے تدفین میں شرکت نہیں کی بلکہ وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ گھاس میں کھڑے ہو کر دل ہی دل میں کچھ کہنے لگا ”اے زہریلے سانپ! کیا تم میری بات سن سکتے ہو۔ تم نے وہ کام کر دکھایا جس کے لیے تمہیں راجستھان کی پہاڑیوں سے یہاں لایا گیا تھا۔ میرا انتقام پورا ہو گیا۔ میرے منصوبے کے مطابق تمہیں کام کرنے کے بعد مر جانا تھا۔ کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ ابھی نہیں تو کچھ عرصے بعد تم مر جاؤ گے۔ بغیر مادہ کے تمہاری نسل آگے نہیں چل سکتی کیونکہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پائے جاتے۔

باریک دو شاخہ زبان لہراتی نظر آرہی تھی۔ بل کی بیوی بولی ”خدا ہمیں محفوظ رکھے، یہ تو کوئی سانپ ہے۔“ بل کیمرن غصے سے بولا: ”پاگل نہ بنو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آئرلینڈ میں قدرتی طور پر کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔ ہر شخص یہ بات جانتا ہے۔“ پھر اس نے بیٹے سے پوچھا: ”بولی، تم تو اسکول میں سائنس پڑھتے ہو، تمہارے خیال میں یہ کیا چیز ہے۔“ لڑکے نے سانپ کی طرف غور سے دیکھا اور کہا: ”یہ یقیناً کچھو ہے جو عموماً جنگل کی گھاس میں پایا جاتا ہے۔“ بگ بلی نے اپنے بیٹے سے کہا: ”یہ جو کچھ بھی ہے، اسے مار کر باہر پھینک دو۔“ بولی اٹھا اور اپنا جوتا نکال کر اس جانور کو مارنے چلا۔ بل کیمرن کے دماغ میں ایک اور خیال آید۔ اس نے کہا: ”ذرا رک جاؤ اور مجھے ایک ڈھکن والا مرتبان دو۔“ مرتبان آیا تو بلی اٹھا اور بہت احتیاط اور بھرتی سے سانپ کو مرتبان میں منتقل کر دیا۔ سانپ بھی آئرلینڈ کے سرد موسم سے کچھ ست ہو گیا تھا۔ بلی کے بیٹے نے پوچھا: ”ابو آپ اس کا کیا کریں گے؟“ بلی نے کہا: ”ہمارے گروہ میں ایک کالا بھارت سے آیا ہے، وہاں بہت سانپ ہوتے ہیں۔ میں ذرا اس کے ساتھ مذاق کروں گا۔ وہ تو شاید خوف کے مارے مر ہی جائے گا۔“ اس نے جیکٹ پہنی، کھانا لیا اور بیگ میں پھر سانپ والے مرتبان کے ساتھ رکھ دیا۔ پھر وہ اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ وہاں سب لوگ مع رام لعل موجود تھے۔ ٹرک میں سوار ہو کر یہ پارٹی کام والی جگہ پر روانہ ہو گئی۔ وہاں کام شروع ہونے سے پہلے چائے کے دوران بل کیمرن نے چپکے چپکے دیگر لوگوں کو بھی بتا دیا کہ وہ اس کالے کے ساتھ کیا مذاق کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے سوچا کہ یہ ایک بے ضرر کیتڑا ہے، رام لعل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لہذا ایسے مذاق میں کوئی حرج نہیں۔ کھانے کے وقفے میں سب لوگ حسب معمول دائرے کی شکل میں بیٹھے۔ رام لعل نے کچھ خیال نہ کیا لیکن باقی لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اس نے اپنا لٹل باکس گھنٹوں پر رکھا اور اسے کھولا۔ سینڈویچ اور سیب کے تھچ چھوٹا سانپ کڈلی مارے بیٹھا تھا۔ رام لعل کی زبردست چنچ سے علاقہ گونج اٹھا اور ساتھ ہی سب مزدور بے ساختہ زور دار قہقہے لگانے لگے۔ رام لعل نے گھبرا کر اپنا لٹل باکس زور سے ہوا میں اچھال دید۔ سانپ اور سینڈویچ تمام چیزیں چاروں طرف گھاس میں گر پڑیں۔ رام لعل چپختے ہوئے کھڑا ہو گیا اور بولا ”یہ سانپ بہت زہریلا اور خطرناک ہے۔“ سب لوگ پھر سے ہنسنے لگے۔ رام لعل نے ان سے کہا: ”یقین کرو، یہ انتہائی زہریلا سانپ ہے۔“ بل کیمرن کی آنکھوں میں ہنسنے ہنسنے آنسو آگئے۔ وہ رام لعل سے کہنے لگا: ”کمالے آدمی، تم تو بہت ہی بے وقوف ہو۔ کیا تمہیں معلوم کہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔“ بگ بلی ہنسنے ہنسنے کچھ تھک گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ گھاس پر لیٹ گیا کہ چند منٹ آرام کر لے۔ تب اسے معمولی چپن کا بھی احساس نہیں ہوا۔

جنید جمشید دلوں میں زندہ رہے گا

مصنف: علی احمد

دنیا میں انسان کا ٹھکانہ عارضی ہے دنیا میں موجود ہر ایک چیز کا وجود عارضی ہے اور وہ فانی ہے اور موت اٹل ہے جس کو دنیا کی کوئی طاقت ٹال نہیں سکتی ہے موت نے ایک نہ ایک ہمیں گلے لگا نا ہے اور ہم پھر اس جہاں فانی سے کوچ کر جانا ہے موت کے بعد کوئی لوٹ کر واپس نہیں آتا ہے اور جب موت کا وقت آتا ہے تو ایک پل کی مہلت نہیں دیتا اور فرشتہ پل میں روح قبض کر پرور کر جاتا ہے اس دنیا میں ہمیں اپنے آنے والے پل کی بھی خبر نہیں کنکس پل موت گلے لگاتی ہے انسان اس عارضی مکاں کو سب کچھ تصور کر لیتا ہے انسان کو بھلا کوں سمجھے کہ کسی سواری کا مسافر منزل کو لوٹ جاتا ہے تاکہ اس سواری کو اپنی منزل تصور کر لیتا ہے جب انسان اس دنیا کو اپنی راحت آسائش سمجھتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ وہ تو چند سانس اوجھلے کر آیا ہے اور دنیا بنانے کی مستی میں مست ہو کر بہت دور چلا جاتا ہے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنا ایسا لگتا ہے کہ اس کی بربادی ہے اگر وہ اس دنیا کی بلندی شہرت دولت چھوڑے تو کیسے چھوڑ جس کے لئے اس نے اتنا طویل سفر طے کیا ہے اور وہ اپنی واپسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے اگر کچھ دیر کے لئے اپنی ذات کا جائزہ لیں یا معاشرے میں اپنے ارد گرد نظر دوڑیں تو ایسے افراد سے دنیا بھری پڑی ہے جنہوں نے اپنی منزل تو پا لی ہے راستے کے چٹاؤ میں غلطی کر بیٹھے ہیں ایک بڑی فتح اور کامیابی کے بعد احساس ہو کہ غلط راستے پر چل کر آئے ہیں تو اس دولت عزت شہرت نے واپسی پر اٹھتے قدموں میں بیڑیاں ڈال دیں اور واپسی کی جانب اٹھتے قدموں کو تھمنے پر مجبور کر دیا پھر جو لوگ ان بیڑیوں کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں تو وہ ساری حیاتی اس کونائیں میں غرق رہتے ہیں کچھ ایسے بھی باہمت ہوتے ہیں جب وہ اس شہرت دولت والی منزل کے قریب ہوتے ہیں یا منزل پا چکے ہوتے ہیں تو ان کے ضمیر کو ملنے والی اللہ کی جانب ہدایت کو اس منزل سے منہ موڑنے پر مجبور کر دیتی ہے اور وہی ہدایت ان بیڑیوں کو توڑ کر اس رائے حق پر لے آتی ہے جس سے شاید وہ اب تک غافل تھا۔



جنید جمشید بھی انہی انسانوں میں سے ایک تھے جو اس ہدایت کو منزل کی پہلی سیڑھی سمجھتے ہوئے اس خدا واحد لائبریک کی راہ پر میں نکل پڑا جس نے اپنی کئی سالوں کی محنت کے بعد حاصل ہونے والی منزل کو پل میں ٹھکرا کر اس حقیقی سفر میں راحت سفر باندھا جس پر چلنے کے لئے اللہ پاک اپنے پیاروں کو نوازتا ہے اس بات سے ہم انکار نہیں سکتے کہ جنید جمشید نے زندگی میں جو بھی کام کیا وہ انتہا تک کیا اور خوب محنت اور لگن سے کیا جس میں وہ پختہ ارادے سے ڈٹ کر اس کام کو سرانجام دیتے تھے اس نے موسیقی کے فن کا آغاز ہی دل سے کیا جس میں اس کے سر سے نکلا پہلا لفظ ہی دل پاکستان تھا جو ایک سچا حب الوطن ہی کر سکتا ہے جنید جمشید 1964

کو جب کچھن اکبر خان جندی کے گھر کر اچی میں پیدا ہوا تو اس وقت کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا ہو گا کہ یہ بچہ ایک دن اتنا عظیم ہو جائے گا کہ اپنے آپ کو رہتی دنیا میں امر کر جائے گا جنید جمشید کے والد اتر فورس میں کپٹن تھے تو فوج سے نسبت کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کو اتر فورس میں پائلٹ بنانا چاہتے تھے اس مقصد کے لئے جنید جمشید نے لاہور کی یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی سے ٹیکنیکل انجینئرنگ ڈگری حاصل کی اور بعد میں پاکستان اتر فورس میں سولین کنٹر کیئر کے طور پر ملازمت حاصل کی جب 1983 میں پہلی مرتبہ جنید جمشید نے راک سگر کے طور پر یونیورسٹی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو شرکاء نے بہت پسند کیا پھر دوستوں کے ساتھ مل کر ایک میوزیکل گروپ بنایا کچھ سالوں کی محنت رنگ لے آئی اور 14 اگست 1987ء کو پاکستان کے یوم آزادی کے دن وطن سے محبت کا اظہار ”دل پاکستان جان پاکستان“ جیسے سدا بہار ملی نغمے سے کیا وہ ملی نغمہ اتنا مشہور ہوا کہ اس وقت لے کر اب تک عوام میں مقبول ہے جو اب بھی دنیا کے بہترین قومی نغموں کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے جنید جمشید کا وائٹل سائنس گروپ مسلسل کامیابیوں کی وجہ سے چھا رہا ہے جنید جمشید نے اپنی صلاحیتوں سے پاکستان میں پاپ میوزک کو بام عروج بخشا 1994ء میں جنید جمشید نے اپنا پہلا سولو البم نکالا جس نے آتے ہی پاکستان کے علاوہ پوری دنیا میں دھوم مچا دی یہ جنید جمشید کی زندگی کا عروج تھا۔

پھر جنید جمشید اتنی شہرت پانے کے بعد بھی اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے اور ہمیشہ اس چیز کو محسوس کرتے تھے کہ ان کی زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے انہوں نے کچھ سال قبل ایک ٹی وی پروگرام میں بتایا تھا جب وہ گلوکاری کے فن میں عروج پر تھے وہ گھٹن محسوس کرتے تھے اور اپنی زندگی کو کسی کی وجہ سے اوجھڑا سمجھتے تھے شاید یہ گھٹن یہ غیر مطمئن ہونے کی کیفیت اور تڑپ وہ بدابت تھی جو ان کے دل میں کسی سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہلکی سی روشنی محسوس کی جاتی ہے ایسی ہلکی اور دھمی روشنی جو ایک اندھیرے کے اختتام اور روشنی کی ابتداء کے درمیان ہوتی ہے جس کو دیکھا تو نہیں جاتا سکتا ہے محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اب اندھیرا اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے جنید جمشید نے اس ہدایت کی اس دھمی روشنی کو اپنی شہرت اور بلندی کے اندھیرے میں ڈوبنے نہیں دیا بلکہ اس روشنی کی کھوج لگانا شروع کر دی آخر اس ہلکی اور دھمی روشنی کی آمد کدھر سے ہے پر اس بات کا اندازہ جنید جمشید کو بھی نہ ہو گا کہ اس ہلکی مدھم روشنی جس کے پیچھے وہ چل پڑا ہے اس کو ایک دن ایسے روشن دن میں لے آئے گی جس سے اس کی دنیا اور آخر سنور جائے گی۔

مولانا طارق جمیل سے ہونے والی اتفاقی ملاقات نے جنید جمشید کی دنیا بدل دی پھر وہ اچانک موسیقی کی دنیا کو خیر باد کہے کر خیر کے راستے چل پڑے اور گھر کے قریب واقع مسجد کے دروازے پر دستک دینے کے بعد اس نے جو لذت خدا کی راہ میں نکل کر پائی جس کی کمی وہ ہمیشہ محسوس کرتا تھا 2004ء کے بعد جنید جمشید تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو گئے اچانک اپنا پیشہ جس کی بنیاد پر ان کو عزت شہرت ملی تھی چھوڑ کر پریشانی تو ہوئی اپنے پرانے کی طرف سے تنقید کے نشتر بھی چلائے گئے لیکن خدا کا بند سجدے کی لذت کو پا چکا تھا جس تنقید کے نشترے اثر ثابت ہو رہے تھے پھر جنید جمشید نے ہمت نہ ہاری اور اس لگن میں بے بے کے نام سے اپنا کاروبار شروع کیا جس کو جاری وساری رکھا جو دنیا میں فیشن برائینڈ بن گیا جس کے آؤٹ لٹ پورے پاکستان میں تھے جنید جمشید مسلسل تبلیغ کی راہ میں چلتے رہے کیونکہ ماضی میں جس غفلت کی اذیت سے وہ گزرتا رہا ہے وہ ہی اس کو اچھے طریقے سے محسوس کر سکتا ہے اس احساس کو لے کر وہ تبلیغ کی راہ پر نکل پڑتا تھا اور اپنے مسلمان بھائیوں کی خدا کی راہ پر لانے کی جستجو کرتا رہا جنید جمشید میں خلق خدا سے محبت کا جذبہ بلند تھا وہ ایک طرف اپنے مسلمان بھائیوں کی آخرت سنوارنے کے لئے تبلیغ کرتا تھا اور ساتھ ہی غریب نادار مفلس بھائیوں کی امداد کرتا تھا ٹی وی پروگراموں کے ذریعے فلاح کا درس دیتا تھا اس نے موسیقی چھوڑی تو حمد ثناء اور نعتیں پڑھنا شروع کر دی کبھی انسانیت کے درس میں ڈوب کر خدمت انسانیت میں ڈٹ جاتے اور گلیوں کے پکڑے صاف کرنے کی مہم میں لگ جاتے اعلیٰ اخلاق کا بیکر محبتیں بانٹنے والا جنید جمشید بچوں بڑوں مردوں عورتوں جوانوں اور بزرگوں سب میں مقبول تھا جس کی وجہ سے دنیا میں 500 با اثر مسلمانوں کی شخصیات میں ان کا نام شامل تھا

جنید جمشید تمام طبقات میں مقبول تھے جس کی وجہ سے ان کا اپنی علماء کے علاوہ لوکاروں کھلاڑیوں کی وی انیکروں صحافیوں سیاست دانوں سب میں میل جول بہت اچھا تھا جس طرف بھی جاتے سب میں گھول مل جاتے مذہبی اور لبرل طبقے میں ایک پل کا کردار ادا کرتے تھے جس سے وہ درس تبلیغ اس لبرل طبقے تک لے جاتے تھے جب 7 دسمبر کو ان کی اچانک فضائی حادثے سب موت پر ہر آنکھ اشک بار تھی ہر دل غم زدہ تھا ہر چہرے پر اواسی چھائی ہوئی تھی جس دن جنید جمشید کی نماز جنازہ ہوا کی گئی اور تدفین کی گئی تو اس دن جنید جمشید کے جنازے کو دیکھ کر رشک آ رہا تھا اور ہر مسلمان کے دل میں ایسی ہی خواہش پیدا ہو رہی ہو گی یا اللہ ایسی دھوم دھام سے اس دنیا سے رخصتی تو اپنے پیارے بندوں کو عطاء کرتا ہے ہمیں بھی اپنے ان پیارے بندوں میں شامل فرما۔

پر بند پیارا تب بنتا ہے جب وہ اللہ کی راہ میں نکل پڑتا ہے پھر اس راہ میں دولت شہرت سب کو اس راہ میں ٹھکرا کر آگے بڑھتا جاتا ہے اور وہ بندہ خدا پھر انسانیت سے پیار بھی کرتا اور غم خواروں کا غم بانٹتا ہے تب جا کر کہیں اس کو ایسی ہی دنیا سے رخصتی نصیب ہوتی ہے پھر مرنے کے بعد بھی وہ انسان دلوں میں زندہ رہتا ہے جسے آج جنید جمشید دلوں میں زندہ ہے

§§§

سائنٹ کٹر

مصنف: علی احمد

جرمن ماہر ڈاکٹر لوزل کا کہنا ہے جرمنی میں پانچ لاکھ افراد اس بیماری کے ابتدائی علاج کے دور سے گزر رہے ہیں جبکہ ایک لاکھ مبتلا ہونے کے بعد زیر علاج ہیں نتائج آنے میں وقت درکار ہوگا۔ طبی رپورٹ کے مطابق ان افراد کے پیٹ کی خاص رگ پانچ سینٹی میٹر تک پھولی ہوئی اور سوجن ہے جس کے سبب وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہے اور ایسے مریضوں کا فوری آپریشن لازمی قرار دیا ہے تاہم کچھ مریضوں کا علاج تشخیص کے بعد شروع کیا جائے گا، لڑا ساؤنڈ سکین سے ڈاکٹروں نے اس بیماری کا پتہ لگایا ہے لیکن جرمنی میں صحت سے منسلک ادارے سکریننگ کرنے کی ڈاکٹروں کو ادائیگی نہیں کرتے اسلئے کئی مریضوں کو خود ادائیگی کرنا ہوتی ہے جو ایک مہنگا علاج ہوتا ہے تاہم روٹین چیکنگ کے دوران اتفاق سے بذریعہ لڑا ساؤنڈ اگر معلوم ہو جائے کہ مریض اس بیماری میں مبتلا ہے تو اسکی ادائیگی صحت کا ادارہ کرتا ہے روٹین چیکنگ میں پیٹ کا لڑا ساؤنڈ یا گردے کی تکلیف سے مراد ہے۔ فیملی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ پینٹھ برس سے زائد افراد کو باقاعدگی سے لڑا ساؤنڈ کروانا چاہئے اور خاص طور سے ان افراد کیلئے زیادہ اہم ہے جو موٹاپے میں مبتلا ہیں یا ذیابیطس ہونے اور بکثرت تمباکو نوشی کرتے ہیں یا کمر کے درد کی شکایت کرتے ہیں۔ پیٹ کے اندرونی نظام میں اکثر معمولی انفیکشن سے بھی اس بیماری میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے کیونکہ انفیکشن کی صورت میں رگیں اکثر زیادہ پھول جاتی ہیں یا اتنی کمزور اور باریک ہو جاتی ہیں کہ پھٹ سکتی ہیں اور خون جاری ہونے کی صورت میں فوری موت بھی واقع ہو سکتی ہے، زیادہ تر مرد اس بیماری میں مبتلا ہیں کیونکہ مردوں کی روزمرہ زندگی گزارنے کا طریقہ خواتین سے مختلف ہوتا ہے مثلاً حفظان صحت پر زیادہ توجہ نہ دینا وغیرہ۔ لڑا ساؤنڈ سے فوٹوز حاصل کرنے کے بعد دوسرا قدم کمپیوٹر ٹومو گرافی سے مطلوبہ رگ کا پتہ لگانے کے بعد آپریشن لازمی ہوتا ہے، پیٹ چاک کرنے کے بعد زخمی رگ کے ساتھ مصنوعی عضو کیمپس لگا دی جاتی ہے جس سے خون کی سرکولیشن جاری رہتی ہے اور پوزیشن تبدیل کر دی جاتی ہے، سنٹینٹ گرافٹ کا استعمال کرتے ہوئے اینڈو ویس کیو لری کو مبی نیشن سے رگوں کو مضبوط کیا جاتا ہے اور مریض تین سے سات دنوں میں فٹ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر لوزل کے مطالعے اور دستاویزی مواد کے پیش نظر ایک سو چوالیس افراد کے سنٹینٹ گرافٹ آپریشن ہوئے اور دو ہزار پندرہ میں اطالوی میگزین دی ایٹالین جرنل آف ویسکولر اینڈوویس کیولر سرجری کے عنوان سے شائع ہوئے جس میں تصدیق کی گئی کہ یہ ہی سائنٹ کٹر کا کامیاب علاج ہے۔

§§§

یہ کسی فلم یا لیبٹ کا نام نہیں بلکہ دنیا بھر میں کئی انسان اس خاموش قاتل کے شکار ہیں اور یہ قاتل انسان کے وجود میں آنے کے بعد اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے انحصار اس بات پر بھی کرتا ہے کہ انسان کس خطے یا ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے روزمرہ کی مصروفیات کیا ہیں، کیا معقول اور صحت مند غذاؤں کا استعمال کیا جا رہا ہے، مکمل نیند لیتا ہے، اور کس شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا میں پچھلی بیماریاں قدیم ہونے کے ساتھ آج کل سائنس کی طرح ترقی بھی کر رہی ہیں سائنس ماہرین جتنا ان بیماریوں کی تہہ یا جڑوں میں جا کر ان کا مطالعہ اور مقابلہ کرتے ہوئے علاج کے طریقے دریافت کر رہے ہیں اتنی ہی تیزی سے کئی بیماریاں انسانوں کی اپنی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی سے جنم لے رہی ہیں اور روز بروز کئی نئی بیماریاں کا شکار ہو کر انسان موت کے منہ میں جا رہے ہیں، کسی نے زیادہ کھا لیا تو بیمار ہو گیا کم کھا یا تو بیمار، زیادہ خواب و خرگوش کے مزے لیتا رہا تو بیمار نیند پوری نہیں ہوئی تو بیمار یہ کہنا مناسب ہو گا کہ انسان کچھ کرے یا نہ کرے بیمار ہو ہی جاتا ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ البرٹ آئین سٹائن معمولی لیکن خطرناک حد تک پیٹ کی موٹی رگ کے پھیل اور سوج جانے سے موت کا شکار ہوا تھا۔ کئی بیماریوں کی اردو میں ٹرانسلیشن کرنا ناممکن ہونے کے ساتھ اردو میں لکھنا نہایت دشوار ہوتا ہے اور اگر حرف بہ حرف درست طریقے سے یعنی ججے کر کے نہ لکھا جائے تو مطالعہ کرنے میں دقت پیش آتی ہے تاہم ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ انگریزی کے حروف کی درست اور صحیح الفاظ میں بامعنی لکھنے کے ساتھ ساتھ مختصر تشریح بھی کروں اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں اس کالم میں بھی کچھ ایسے پیچیدہ طبی الفاظ شامل ہیں جنہیں اردو رسم الخط میں تحریر کرنے میں کافی محنت کی ہے تاکہ دوران مطالعہ آسانی رہے۔ حالیہ طبی رپورٹ کے مطابق پیٹ کے اندر پلٹے والی قدیم بیماری کا واضح طور سے مطالعہ کیا گیا جس کے نتائج منفی ظاہر ہوئے ہیں، جرمن ماہرین کا کہنا ہے صرف جرمنی میں پینٹھ برس سے زائد کے افراد جن کی تعداد پانچ لاکھ ہے اس بیماری میں مبتلا ہیں، پیٹ کی اس بیماری کو کسی بھی زبان میں ادا کرنا نہایت مشکل ہے جبکہ مکمل جانکاری حاصل کرنا اور زیادہ مشکل۔ اینڈو میٹل اینیو رسم جسے آڈرنک اینیو رسم بھی کہا جاتا ہے ایک مہلک اور جان لیوا بیماری ہے۔ زیادہ تر افراد اسکی علامات اور اثرات سے واقف نہیں کیونکہ یہ خاموشی سے جسم اور خاص طور پر پیٹ میں نہایت خاموشی سے پروان چڑھتی ہے اور اسی لئے اسے خاموش قاتل یعنی سائنٹ کٹر کہا جاتا ہے۔



ہائی ٹیک

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

چارلی چپلن ایک لیجنڈ آرٹسٹ تھا اس نے بہت کم عرصے میں اپنی سوچ اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہت کچھ پروڈیوس کرنے کے بعد دکھا دیا کہ دنیا میں ہر طرح کے انسان جیسے ہیں اس کی کامیابی فلمیں صرف انٹرنیشنل ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی تھیں اسکی نقالی آج بھی دنیا بھر میں کی جاتی ہے۔ تھیٹر، سٹیج شو، سنیما اور ٹیلی ویژن نے نیا ٹرینڈ لا کر دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے لیکن ساتھ ساتھ آج بھی کئی لوگ ان چیزوں سے شدید نفرت کرتے اور آرٹسٹوں کو میراثی اور کجتر وغیرہ کہتے ہیں حالانکہ آرٹسٹ وہ کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں انسان ہونے کے ساتھ اپنے اندر جذبات اور احساسات کا سمندر رکھتے ہیں اور آرٹسٹ سے نفرت کرنا انسانیت سے نفرت کرنے کے مترادف ہے۔ کئی برسوں تک سنیما میں اگرچہ ہر دور میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ نیا دکھایا جاتا اور شائقین محفوظ ہوتے لیکن ٹی وی آنے کے بعد انسانوں کی سوچ یکسر بدل گئی کیونکہ چھوٹی سکرین پر ایڈورٹائزنگ کی بدولت دنیا کی ہر اچھی اور بری شے نشر کی جانے لگی ایک طرف اگر معلومات کا خزانہ ہوتیں تو دوسری طرف کئی انسانوں کے لئے منفی بھی ثابت ہوتیں



ساتھ اور ستر کی دہائی میں ٹی وی پر ہر نئی شے کو دیکھ کر ہر ایک کی زبان پر یہ ہوتا کہ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، سائنس کتنی ترقی کر گئی ہے وغیرہ۔ بات کچھ عجیب سی ہے کہ کچھ لوگ سائنسی ایجادات کو ماننے ہوئے عیش عیش کرتے ہیں ایجادات سے مستفید ہوتے ہیں اور پھر اسے برا بھی سمجھتے ہیں۔ سائنس اگرچہ خود ترقی نہیں کرتی بلکہ انسان اپنے دماغ اور سوچ کو بروئے کار لا کر اس کھوج میں رہتا ہے کہ کچھ نیا ایجاد کیا جائے یہ کہنا غلط نہیں کہ ہر انسان ایک سائنس دان ہے یعنی اسکا دماغ اتنا فاسٹ ہے کہ وہ چاہے تو ہر سینکڑ نئی سوچ سے دنیا تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن افسوس کہ کچھ لوگ اپنا دماغ استعمال کرتے ہیں اور کچھ جانتے ہی نہیں کہ دماغ آخر ہوتا کیا ہے۔ مستقبل قریب یعنی دو ہزار پچیس تک سائنسی دنیا میں نیا انقلاب آجائے گا آنے والے سات آٹھ برسوں کے اندر ہم کئی پرانی اشیاء سے محروم ہو جائیں گے اور یہ اشیاء ماضی کا حصہ کہلاتے ہوئے اینٹک شمار کی جائیں گی جیسے کہ آج کل ٹرانزسٹر یا ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کا کہیں نام و نشان نہیں ہے آج کی جزیشن نہیں جانتی کہ کیسٹ ریکارڈر کیا ہوتا ہے۔ ہائی ٹیک یعنی ہائی ٹیکنالوجی دنیا بھر میں سپیڈ پکڑ چکی ہے اور ہر انسان کی ضرورت بھی بن گئی ہے کیونکہ جتنی تیزی سے سائنس ترقی کر رہی ہے انسان کیلئے سہولت پیدا ہو رہی ہے اتنی تیز رفتاری سے انسان ست اور کمنا ہوتا جا رہا ہے۔ لیکویڈ کرسٹل ڈسپلے جنہیں ایل سی ڈی ٹیلی ویژن کہا جاتا ہے حیرت انگیز طور پر اپنی مخصوص بناوٹ سے دنیا بھر میں مقام حاصل کر چکے ہیں اور موٹی فونڈ والے ٹی وی کو کچرے کے ڈبے یعنی ری سائیکلنگ کمپنیز کو واپس کر دیا گیا ہے آج ماضی کا حصہ بن چکے ہیں کیونکہ ایل سی ڈی ٹی وی بہت پتلے یعنی سارٹ ہونے کے ساتھ بہت کم جگہ لیتے اور آج کل بہت ارزاں قیمت پر دستیاب ہیں اسکے باوجود گزشتہ برس ایل جی کمپنی نے مستقبل کیلئے ایک نیا ٹی وی متعارف کروایا ہے جسے اورگائیک لائٹ ایبلمنگ ڈاؤنڈ یعنی او ایل ای ڈی کانام دیا یہ نیا ٹی وی اپنی منفرد لائٹس سے فکشن کرے گا جس سے انرجی کی بچت ہوگی اور آج کل کے فور کے ٹی وی سے زیادہ صاف وشفاف تصویر پیش کرے گا علاوہ ازیں یہ حیرت انگیز ٹی وی کاغذ کی طرف ہارڈک ہونے کیساتھ رول اور فولڈ کیا جاسکے گا کمپنی کے ترجمان کا کہنا ہے اس ڈیویو سیریز یعنی وال پیپرز کی موٹائی اندازً دو سے تین ملی میٹر ہوگی مقناطیسی سسٹم سے دیوار میں ایڈجسٹ کیا جاسکے گا عام استعمال کے لئے اس سال کے آخر میں مارکیٹ میں دستیاب ہو گا۔ لیڈ لیپ۔ عام بلب یا انرجی سیور لیپس بہت جلد مارکیٹ سے ہٹا دئے جائیں گے انکی جگہ پر کرنے کیلئے او لیڈ لیپ دستیاب ہوئے ان نئے لیپ کا موازنہ ایل جی کے ٹی وی سسٹم سے کیا جا سکتا ہے معروف کمپنیز فلیس اور اوسرام بہت جلد یہ لیپ متعارف کروائیں گی۔ سٹورج میڈیا۔ آج کل سی ڈی، ڈی وی ڈیز ڈسک کے علاوہ یو ایس بی سٹکس پر تمام ڈیٹا منتقل کرنے کے بعد سٹورج کیا جاتا ہے جبکہ آنے والے برسوں میں یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا اور اسکی جگہ بوکس، ایمزون اور گوگل کمپنیز ایک نیا سٹورج میڈیا متعارف کروائیں گے جس میں وائی فائی سسٹم کے تحت آن لمیٹڈ ڈیٹا سٹور کیا جاسکے گا۔ گیم کونزولز۔ گیمز کھیلنے والے یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کنزولر یا دیگر کونزولز کے بغیر اپنی من پسند گیم ایکس بوکس یا پلے سٹیشن پر کھیل سکیں لیکن مستقبل قریب میں این وائی ڈیٹا کمپنی کونزولز فری کلاؤڈ گیم سسٹم متعارف کرواتے گی جس سے گیمز کھیلی جائیں گی یہ کمپنی جی فورس ناؤ گیم سٹریمنگ سروس کے ذریعے گیم کھیلنے والوں کیلئے سہولت پیدا کرے گی علاوہ ازیں اپ لوڈ اور ڈاؤن لوڈ سسٹم کو بھی ریوٹ سرور کے ذریعے ہائی ٹیک طریقے سے استعمال کیا جاسکے گا کیبل چارجر۔ سیمنگ کمپنی نے حال ہی میں کیبل فری چارجر متعارف کروایا ہے ایک مخصوص پیڈ کے ذریعے سارٹ فونز، لیپ ٹاپ اور دیگر الیکٹرونک انٹرومنٹس چارج کئے جا سکیں گے، پلگ یا ایڈاپٹر کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی، اپیل کمپنی نے بھی کیبل فری ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف کرائی ہے جس سے تمام آلات کیبل کے بغیر چارج کئے جائیں گے۔ ریوٹ کنزولز۔ پروگرامنگ

اور دیگر فنکشن کے لئے ریوٹ کنزول کی بجائے وائس سسٹم سے تمام آلات فنکشن کریں گے اس سسٹم کیلئے سینسور استعمال کیا جائے گا مثلاً ایکس بوکس یا پلے سٹیشن کو ٹی وی کے والیم سے منسلک کرنے کے بعد وائس کنزول سے استعمال کیا جاسکے گا۔ پلاسٹک کارڈز اور پاس ورڈز سسٹم بھی بہت جلد ختم کرنے کے بعد تمام ڈیٹا سمارٹ فونز پر منتقل کرنے سے ہر قسم کی شاپنگ کی جاسکے گی ہائیو میٹرک سینر اور ہائی ٹیک الفا بینک سسٹم کے علاوہ فنگر پرنٹس اور چہرے کی شناخت سے تمام عوامل باآسانی طے پائیں گے۔ انسان ایک طرف کہتا ہے کہ سائنس ترقی کر رہی ہے ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور دوسری طرف سائنسدانوں کو برا بھلا بھی کہا جاتا ہے۔ چارلی چپلن آج زندہ ہوتا تو بہترین ایکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سائنسدان بھی ہوتا جو ہنستے ہنساتے بہت کچھ دریافت کرتا اور لوگ اس کی تعریف بھی کرتے۔

§§§

ہمارا گھر مندر بن گیا تھا

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

ایک مضمون دیکھنے کچھ اس طرح لکھا ہے کہ "گھروں سے دریافت ہونے والی عجیب اشیاء کوئی مالا مال تو کوئی خوف سے نڈھال"

اس میں مغربی ممالک میں مختلف گھروں سے پرانے مکینوں کی چھوڑی ہوئی اشیاء کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آسٹریا میں کسی گھر میں مکین کو ہاتھ روم کی دیوار سے ایک کوریائی میزائل ملا۔ ایک امیر جرمن باشندے کو اپنے گھر کے تہ خانے سے جنگ عظیم کے دور کے ہتھیار ملے جن میں ایک نیک اور توپ بھی شامل تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے ملک چیک ری پبلک میں گھر کے اندر کسی کام کے سب کھدائی کی گئی تو کسی گرجا گھر کی چار صد سال پرانی گھنٹی ملی۔

لیکن یہ جرائی کی بات نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی ایسی اشیاء نکلتی رہتی ہیں۔

اور ایسی ہی کچھ اشیاء مجھے ماضی کی وادیوں میں لے جا رہی ہیں۔۔۔ نوشکی۔ بلوچستان کا ایک دور افتادہ مقام ہے جو تقریباً ایران جانے والی شاہ راہ پر واقع ہے۔ یہ قصبہ انگریزوں نے نہایت ہی منصوبہ بندی سے بنایا تھا۔ تمام سڑکیں گلیاں کشادہ اور ایک دوسرے کے سے قائمہ زاویہ بناتی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ 1954 - 55 کا زمانہ تھا۔ ہم اسی خوبصورت قصبے میں رہتے تھے۔ مکان کا نمبر بھی ابھی تک یاد ہے۔ یہ 102 تھا۔ انگریزوں نے اپنے لئے ایک ٹینس کورٹ بھی بنایا ہوا تھا۔ جس کے فرش پر ہم خانے بنا کر اسٹاپو وغیرہ کھیلا کرتے تھے۔

قیام پاکستان سے قبل یہاں ہندو کافی تعداد میں تھے کیونکہ ارد گرد کے علاقوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا اور ہندو اس تجارت کے کرتا دھرتا تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کافی تعداد میں ہندو یہاں سے ہجرت کر کے بھارت چلے گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی ایک کافی تعداد رہ گئی تھی۔

ایک دن اباجان مرحوم نے گھر کے صحن میں کیاری بنا کر مختلف پھول لگانے کا ارادہ کیا۔ دروازے کے قریب ہی ایک مناسب جگہ دیکھ کر کھدائی کی۔ ہم بچے بھی اباجان کا ساتھ دے رہے تھے اور مٹی اٹھا اٹھا کر قریب ہی ڈھیر کرتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک چھوٹا سا پتھر نیچے گرا۔ میں چونک گیا کہ پوری مٹی میں پتھر نہیں تھا یہ کہاں سے نکل آیا۔ اسے اٹھایا اور اسے دیکھنے لگا۔ بھائی جان جو قریب ہی کھڑے تھے انہیں بھی تجسس ہوا اور وہ بھی کام چھوڑ کر میرے قریب آگئے اور اسکی مٹی صاف کرنے لگے۔ اور ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ وہ پتھر نہیں تھا بلکہ ایک گائے کی شکل کا کھلونا تھا۔

میں اس وقت چار پانچ برس کا تھا۔ میں نے تو اسی وقت اس سے کھینا شروع کر دیا۔

اباجان مرحوم نے کیاری میں بیج بودے۔ ایک دو پھیریاں بھی اباجان مرحوم نے کہیں سے لا کر لگا دیں۔ ایک دو دن گزر گئے۔ ہم نے گائے کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی۔

نہ جانے ہندوؤں کو کیسے اس کا علم ہو گیا۔

غالباً باقی مرحومہ یا بھائی جان میں سے کسی نے اسکول میں میں تذکرہ کیا تھا اور کسی ہم جماعت کو وہ گائے دکھائی بھی تھی۔ اس کے بعد تو ہندو خواتین کا ہمارے گھر تانتا بندھ گیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا چیزیں لے کر آئیں، اور اس مقدس پوتر دھرتی جہاں سے لکڑی کی گائے نکلی تھی کے پھیرے لگاتیں۔ پھر کسی نادیدہ ہستی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتیں اور سر نہوڑائے بیٹھ جاتیں۔ دھیمی دھیمی آواز میں کوئی اشلوک پڑھتیں۔ اس کیاری کی مٹی کو اپنی انگلی سے چھوئیں اور نہ جانے کیا رسومات کرتیں۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی گھنٹی ہوتی تھی اسے ہلکی ہلکی آواز میں بجاتی تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی کہ جب والدین نہ ہوں اس وقت آئیں اور اپنی رسومات ادا کریں۔ یہ کیا ہو رہا تھا اس کا تو ہم بچوں کو علم نہیں تھا لیکن ان کے آنے سے ہم خوش بہت ہوتے تھے کیوں کہ وہ طرح طرح کی مٹھائیاں، لڈو وغیرہ پیتل کی تھالیوں میں رکھ کے لاتیں اور کیاری کے گرد ان کو لیکر گھومتے اور ہمیں بھی پرشاد ہے کہہ کر دیتی تھیں۔ ہمارا گھر تو ایک قسم کا مندر بن گیا تھا۔ بعد میں امی آئیں تو ہمیں بہت غصہ ہوتی تھیں۔ خیر بعد میں اباجان نے وہ گائے وہاں کے ایک معتبر ہندو کو دے دی تھی۔ ہندو اس مقام سے بہت سی مٹی بھی کھود کر لے گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پوتر مٹی ہے۔ اس کے بدلے میں ہندوؤں نے کہیں اور سے مٹی لا کر ڈال دی تھی۔

اس طرح کا ایک قصہ ابن صفی (مشہور جاسوسی ناول نگار۔۔۔ عمران فریدی اور کیپٹن حمید کے کرداروں کے خالق) کے فرزند جناب احمد صفی بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ راولپنڈی میں نانا ابو کو جو گھر فوج کی طرف سے الاٹ ہوا وہ اس سے قبل کسی ہندو خاندان کا تھا جو ہجرت کر گیا تھا۔ والدہ مرحومہ نے بتایا کہ ایک کمرے کی دیوار دھری بنی ہوئی تھی اور اس پر ہاتھ مارتے تو جیسے برتنوں کے جھنجھٹانے کی آواز آتی تھی۔۔۔ نانا ابو کے سخت حکم کی وجہ سے کسی نے بھی اس دیوار کو نہ چھیڑا۔ بعد کو جب یہ مکان کسی اور کو بیچا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اس دیوار کو توڑا تو اندر سے گرہتی کا پورا سلمان برآمد ہوا۔ شلڈ کسی کے جہیز کے لیے رکھا گیا تھا۔۔۔ اور نہ جانے اس سلمان کے علاوہ کیا کیا لٹکا ہو جس کا پتہ ہی نہ چل سکا۔۔۔ ہجرت کے زمانے میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

اس طرح کا ایک واقعہ جنگ اخبار کے کالم "ناقابل فراموش" میں بھی چھپا تھا۔ ایک مسلمان خاندان

بھارت سے ہجرت کر کے آیا تو اس خاندان کو کراچی میں کوئی فلیٹ الاٹ ہوا۔ وہ اس میں رہنے لگے۔ ایک دن کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پتہ چلا کہ کوئی اجنبی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ہندوستان سے آیا ہے اور ہجرت سے پہلے اسی فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ہندو ہے۔ دو تین دن فلیٹ میں آتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے راز دارانہ انداز میں کہا کہ اس کے پاکستان آنے کا ایک مقصد ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ محلے والے اس خاندان کے اخلاق، کردار اور ایمانداری کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اس ہندو نے کہا کہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کے بعد اسے امید واثق ہے کہ مقصد میں کامیابی ہو جائے گی۔ اس تمہید کے بعد اس ہندو نے کہا کہ ہمارے کے وقت جب وہ ہندوستان جا رہا تھا تو اس کے پاس بہت سا سونا تھا لیکن اس وقت کے حالات میں اسے لے جانا بہت دشوار تھا۔ آخر اس ہندو کو ایک ہی حل سمجھ میں آیا کہ سونا اسی فلیٹ میں چھوڑ دیا جائے اور بعد میں حالات صحیح ہو جائیں تو لے جائے۔ اس ہندو نے سونے کو باریک سی تار میں تبدیل کیا اور گھر کی چھت اور دیواروں میں بچھی ہوئی بجلی کی تاروں کے ساتھ ساتھ یہ سونے کی تار بھی بچھادی۔ اس ہندو نے کہا کہ اب اسکی بہن یا بیٹی کی شادی ہے اور وہ اس امید پر پاکستان آیا ہے کہ اسے اپنا سونا مل جائے گا

پاکستانی نے بغیر کسی تردد کے کہا "مجھے تو اس کا علم نہیں لیکن جناب یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ بلا کسی تاہل کے اپنی امانت لے جا سکتے ہیں"

ہندوستان سے آئے ہوئے فرد کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ تو سوچ کر آیا تھا کہ سنے مالک مکان کو اس میں سے نصف حصہ دے دے گا لیکن یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ خیر قصہ مختصر سابق مالک نے پوری رات لگا کر بجلی کی تاروں کے ساتھ لگا ہوا اپنا سونا نکال لیا۔ اس نے سنے مالک مکان کو ایک بار پھر اپنی پیش کش دہرائی لیکن پاکستانی کا کہنا تھا کہ وہ شے جس کا مکان سے کسی طرح کا تعلق ہی نہیں بنتا وہ کیسے لے سکتا ہے۔

قصہ مختصر ہندوستانی باشندے نے سونے کی تاریں لیں۔ اس نے جانے کیا انتظام کئے تھے کہ بحیریت اپنے ملک چلا گیا۔ وہاں جا کر بحیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ دو مہینے بعد اس کی طرف سے شادی کا رڈ بھی آیا جس میں اس پورے پاکستانی خاندان کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

ناقابل فراموش میں شائع شدہ کہانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ غالباً 1960 یا 1961 کا قصہ ہے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ جب وہ مشرقی پنجاب یا بھارت کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور الاٹ شدہ مکان میں داخل ہوئے تو ایسے لگتا تھا کہ اصل مکین کہیں نزدیک ہی گئے ہیں۔ جانے والے ہندوؤں کو کامل یقین تھا کہ واپس اپنے گھروں میں آئیں گے

- قرہ العین حیدر اپنی کتاب ”روشنی کی رفتار“ صفحہ 116 پر لکھتی ہیں کہ جب اسپین سے مسلمان نکل کر مراکش پہنچ رہے تھے تو وہ اپنے اندلی گھر کی چابیاں مراکش میں دیواروں پر ٹانگ دی تھیں انہیں امید تھی کہ واپسی ہوگی۔

§§§
